مذہب اور ریاست قانون کے تناظر میں

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

مغرب اور اسلام کے اس خصوصی شمارے میں یورپ کے ممالک جرمنی، ہالینڈ، پولینڈ، بیلجیئم، برطانیہ اور مجموعی طور پر یورپی یونین کے حوالے سے مذہب اور ریاست کے تعلق پر مقامی دستور اور قانون کی روشنی میں تحقیقی مواد پیش کیا جا رہا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب سے بے زاری اور بغاوت کے باوجود قومی روایات اور معاشرتی ضروریات کی بنا پر وہ عیسائیت جو سولہویں صدی سے عالم نزع میں مبتلا ہوئی اور آخر کار مذہب اور ریاست کی عملی دوری نے اسے ایک ذاتی مذہب میں تبدیل کر دیا، زمانے کے تمام تر نامساعد حالات کے باوجود نہ صرف رسمی طور پر بلکہ ریاستی سطح پر آج بھی اپنا وجود تسلیم کروا رہی ہے۔

پاکستان اور خاص طور پر ان ممالک کے تناظر میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، چار بنیادی سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں: اولاً، ایک مسلم اکثریت کے ملک میں مذہبی اقلیات کی دستوری اور قانونی حیثیت کیا ہونی چاہیے؟ دوئم، جہاں پر مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں اور ریاست اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہو ان کے حقوق اور دعوت کی نوعیت کیا ہوگی؟ ان کا ثقافتی تحفظ کس طرح کیا جائے گا۔ سوئم، جو ممالک اپنے آپ کو سیکولر نہیں کہتے اور ریاست کا مذہب بھی تسلیم کرتے ہیں، وہاں پر مسلمانوں کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟ اور چہارم، عالمگیریت اور ثنویت کے دور میں اسلام جو اپنی حقانیت کا اعلان کرتا ہے، بین المذاہب مکالمے میں اس کا کیا مقام ہوگا؟ ہم اختصار کے ساتھ ان چار پہلوؤں کو نذرِ قارئین کرنا چاہتے ہیں۔

اسلامی مملکت میں اقلیات کی حیثیت

اسلام کے امتیازات میں ایک نمایاں خوبی اس کا تصورِ دین ہے۔ جسے قرآن کریم نے ایک جانب دینِ حق کی اصطلاح سے واضح کیا ہے اور دوسری جانب دینِ فطرت کے تصور سے اس کی وضاحت کی ہے۔ قرآنِ کریم دین کو انسان کی اخلاقی اور وجودی ضرورت قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انسان کی تخلیق کے حوالے سے وہ نہ صرف اسے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی مخلوق قرار دیتا ہے بلکہ اس مخلوق کو دیگر مخلوقات سے اپنی قوتِ ارادی اور خیر وشر میں امتیاز کرنے کی صلاحیت کی بنا پر اشرف المخلوقات قرار دیتا ہے۔

اس اشرف المخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے محض پیدا کر کے آزاد نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کی فطرت میں اپنے رب کو تلاش کرنے اور اس کی بندگی کرنے کا جذبہ ودیعت کر دیا۔ اور اسے زمین پر خلیفہ بنا کر ایک اہم ذمہ داری یہ سونپ دی کہ وہ بھلائی اور خیر کو پھیلائے اور برائی اور شر کو دور کرے۔

یہ وہ بنیادی تعلیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ تمام انبیاء کرام نے انسانی تہذیب کے ہر دور میں دی۔ اس بنا پر قرآن انسان کا اولین اور بنیادی دین اللہ کی اطاعت و بندگی یا اسلام کو قرار دیتا ہے، یہودیت ہو یا عیسائیت یا کوئی اور مذہب، اسلام کے زاویہ سے ان سب کی مرکزی تعلیم خالق وحدہٗ لاشریک کی بندگی اور الہامی ہدایت پر مبنی اخلاقی رویہ کا اختیار کرنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اخلاقی فریضہ کا ادا کرنا ہی تھی، جس میں بعد میں مختلف مذاہب نے تبدیلی وانحراف پیدا کر لیا۔

اسلام اپنے بارے میں وضاحت سے یہ کہتا ہے کہ وہ انسان کا اولین اور اصل دین ہے۔ اس لیے وہ تمام انسانوں کو اس دین کی دعوت دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک اسلامی ریاست میں نہ صرف ان مذاہب کو جو آخر کار ایک اعلیٰ خالق کو مانتے ہیں بلکہ ان مذاہب کو بھی جو مشرکانہ تعلیمات رکھتے ہوں، معاشرہ میں آزادی کے ساتھ قائم رہنے اور اپنے عقائد کے لحاظ سے رسومات ادا کرنے کا

حق دیتا ہے۔ سورۃ الکافرون کا بنیادی مضمون توحید ہے لیکن وہ ساتھ ہی توحید کا انکار کرنے والوں کو بھی یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنے مذاہب کی پیروی کرتے رہیں، جب کہ دینِ اسلام کے ماننے والے اسلام پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ اسی طرح البقرۃ کی آیت ۲۵۶ یہ اصول واضح کر دیتی ہے کہ دین میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں ہے، کسی فرد کو قوت کے دباؤ سے مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک مثالی اسلامی ریاست میں اقلیات کے لیے تمام تر مذہبی آزادیاں تسلیم کی جاتی ہیں لیکن چونکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اس لیے وہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب کی اشاعت کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ اپنے مناسکِ عبادت آزادی سے ادا کر سکتے ہیں، ان کے تعلیمی ادارے ان کے زیر اختیار کام کر سکتے ہیں، لیکن وہ ریاستی وسائل کو ریاست کے نظریہ کے خلاف استعمال نہیں کر سکتے۔

دورِ خلافتِ راشدہ ہو یا بعد میں بنیادی سیاسی تبدیلی کے باوجود مسلمانوں کا دورِ حکومت، مذہبی اقلیات کے ذاتی حقوق کا تحفظ ریاست کا فریضہ رہا ہے۔ جب یورپ میں یہودیوں کو عدم رواداری کا سامنا ہوا تو انہوں نے اسپین اور شام میں پناہ لی اور بطور اقلیت اپنی مذہبی، ثقافتی اور دیگر سرگرمیوں کو مکمل آزادی کے ساتھ جاری رکھا۔ حتیٰ کہ یہودیت کے بعض عظیم علمی کارنامے اسی دور میں وجود میں آئے مثلاً ابن مامون یا Moses Maimonides کی تورات کی تفسیر مسلمانوں کے دورِ ہسپانیہ میں وجود میں آئی جو آج تک اہم سند اور ماخذ کا مقام رکھتی ہے اور جس کا عربی سے عبرانی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ بعد میں وجود میں آیا۔

اس کے مقابلے میں وہ ممالک جو اپنے آپ کو نظریاتی طور پر سیکولر کہتے ہیں، ان کا سیکولر کہنا اسی وقت کوئی معنی رکھتا ہے جب وہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو لادینیت پر مجبور نہ کریں اور ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی اجازت دیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ مغربی ممالک بالعموم مسلمانوں یا دیگر غیر اکثریتی مذاہب کو اپنے ہاں آزادی دیتے ہیں، اس لیے ایک

اسلامی نظریاتی ملک بھی اپنے ہاں دیگر مذاہب کو یہی حق دے، ایک غیر عقلی مطالبہ ہے۔ اگر مغربی ممالک اپنے آپ کو کسی مذہب سے نظریاتی طور پر متعلق کرتے تو ان کو بھی یہ استحقاق ہوتا کہ وہ کسی دوسرے مذہب کی ترویج کی اجازت نہ دیں۔

لادینی ممالک میں اقلیاتی مذاہب کا مقام

جو ممالک اپنے بارے میں دستور میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ سیکولر ہیں، یعنی مذہب کا ریاست میں کوئی دخل نہیں، وہ دستوری طور پر دہریت اور مذہبیت دونوں کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ اپنی فکر کو پیش کرے اور عوام آزادی رائے سے جس بات کو چاہیں اختیار کریں، اس لیے ایسے ممالک میں اسلامی دعوت پیش کرنے کی اجازت دینا مسلمانوں سے کسی رعایت کا اظہار نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ ان کا دستوری حق ہے جسے وہ استعمال کرتے ہوئے دراصل ملک کے دستور کی پیروی کر رہے ہوتے ہیں۔

مغرب میں ایسے ممالک میں فرانس اور جرمنی کی مثال دی جا سکتی ہے لیکن ریاست کے سیکولر ہونے کے باوجود ان ممالک میں جو مقام اور مرتبہ ثقافتی اور سیاسی طور پر عیسائیت کو حاصل ہے وہ دیگر مذاہب کو حاصل نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کے بعض ممالک اپنی آنکھ کا شہتیر نہ دیکھ سکتے ہوں جب کہ دوسرے کی آنکھ میں تنکا بھی انھیں سخت ناگوار گزرے۔

جو ممالک اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں لیکن اپنی روایات اور آبادی کی معاشرتی ضرورت کے طور پر کسی مذہب کی پشت پناہی کرتے ہیں ان میں مسلم کمیونٹی کو ملکی دستور کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل طے کرنا چاہیے۔ مثلاً بیلجیئم میں کیتھولک فرقے کو جو مراعات حاصل ہیں، جن میں چرچ کے رہنما کی تنخواہ، رہائش اور خود چرچ کی عمارت کی دیکھ بھال کے لیے سرکاری رقم کا فراہم کرنا۔ اسی نوعیت کی مراعات یہودیوں نے بطور شہری حاصل کی ہیں۔ مسلمانوں کو بھی اپنے پیدائشی شہری حق کو استعمال کرتے ہوئے ان سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ اسلام کی دعوت کے مواقع کو پوری حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ

استعمال کرنا چاہیے۔

ایک مسلمان شہری جس ملک میں مقیم ہے، اور وہ وہاں کے نظام کا حصہ ہے، ٹیکس ادا کرتا ہے اور اپنے تمام شہری معاملات میں مثلاً ووٹ کا استعمال، ایوان نمائندگان میں شرکت یا اس کے لیے اپنی رائے کا استعمال کرتا ہے تو ایسے بہت سے کام جو افضل طور پر تو دار السلام میں ادا کیے جا سکتے ہیں، وہ ان میں سے بہت سے کام دار السلام میں نہ ہونے کے باوجود بہر حال کر سکتا ہے، مثلاً ایسے مدارس کا قیام جن میں مقامی نظام تعلیم کے ساتھ دینی تربیت کے مواقع موجود ہوں۔ وہ ایسے کاروبار کو فروغ دے سکتا ہے، جس کا انحصار نہ سود پر ہو اور نہ کسی ممنوعہ شے کی خرید و فروخت کی جا رہی ہو۔

اسلام کسی ایک مخصوص خطہ یا قوم کا دین بن کر نہیں آیا یہ پوری انسانیت کے لیے جامع اور کامل ہدایات کی شکل میں آیا ہے اور روزِ اوّل سے اس نے جس معاشرت کو پیدا کیا، اس میں ایک سے زائد مذاہب کے ماننے والوں نے اسلامی ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے اپنی مذہبی رسوم کو ادا کیا ہے، اپنی تعلیمات اور اپنی کتب پر عمل کیا اور اگر انہوں نے ملکی دفاع میں حصہ لیا تو ان کے حقوق بھی عملاً وہی قرار پائے جو ایک مسلمان کے لیے تھے۔ بوڑھا ہونے پر ان کی کفالت کی گئی، ان پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا، ان کا دفاع کیا گیا اور ان کی جان، مال، عزت اور شہرت کی حفاظت کی گئی۔

اگر کسی ایسے ملک میں جہاں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں، ملکی دستور انہیں بطور شہری بعض حقوق سے نوازتا ہے تو ان کا استعمال کرنا نہ استحصال ہے نہ اسلام سے انحراف۔ اس لیے یورپی اور دیگر ممالک میں جہاں مسلمان بطور ایک ملت اور امت پائے جاتے ہیں انھیں مقامی قانون اور دستور کو تحقیقی زاویہ سے مطالعہ کرنا چاہیے اور اپنے جائز حقوق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

عالمگیریت اور ثنویت

عالمگیریت کے بے شمار فوائد ہیں۔ لیکن اتصالات میں ترقی اور لحہ بہ لحہ دنیا میں ہونے والے واقعات سے آگاہی، معاشی معاملات میں برقی ذرائع کا استعمال، ابلاغِ عامہ کی عالمی پہنچ اور مزید

فوائد کے پورے اعتراف کے ساتھ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آج عالمگیریت عملاً ایک نئی استحصالی تہذیب کی شکل اختیار کرگئی ہے، جس کے پیمانے اور معیار یورپ اور امریکہ میں طے پاتے ہیں اور جو ان کی پیروی کرے وہ عالمگیریت میں موجود اور جو ان کو نہ مانے یا انحراف کرے عالمگیریت سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ یہ معیار تعلیم کے ہوں، معیشت کے ہوں یا سیاست وثقافت کے، جب تک ان کی اطاعت کی جاتی ہے، عالمگیرت خوش رہتی ہے۔ اس تناظر میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ دور ثنویت کا ہے، اس لیے ایک سے زائد ثقافتیں اور تہذیبیں متحارب ہوئے بغیر ایک ساتھ رہ سکتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو نظری طور پر یہ بہت مناسب اصول ہے لیکن یورپ کے بعض ممالک نے اپنی ثقافت کو معیار بناتے ہوئے مذہبی اقلیات کو بعض بنیادی وظائف سے محروم کر دیا ہے جن میں خواتین کے لیے اسکارف کا استعمال کرنا ایک عرصہ سے مسئلہ بنا ہوا ہے۔

اسلام ثنویت کو محض نظری طور پر نہیں عملاً اسلامی معاشرہ اور ریاست میں رائج کرنے والا دین ہے، وہ غیر مسلم اقلیات کو اپنی مراسم عبادت، لباس، طعام، معاشرت کی پوری آزادی تاریخ کے ہر دور میں دیتا ہے۔ آج مسلمان جن ممالک میں اکثریت میں نہیں ہیں انھیں اپنے انسانی حقوق پر موجودہ دستوری ذرائع سے جدوجہد کرنی چاہیے تاکہ وہ اپنی ثقافت اور پہچان کو برقرار رکھ سکیں۔ مسلم کمیونٹی کو خصوصاً بین المذاہبی مکالمے کے ذریعہ اپنی اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی ثقافت اور پہچان کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے پروگرام مرتب کرنے چاہئیں جو رائے عامہ پر اثر ڈال سکیں اور نہ صرف مسلمان بلکہ دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی آئندہ نسلوں کو ان کے ورثہ سے متعارف کرا سکیں۔

یورپی یونین کے قانونی نظام میں مذہب اور مذہبی طبقات

سِلویو فیراری (Silvio Ferrari)

خلاصہ

اس مضمون میں مذہبی معاملات کے حوالے سے رُکن ممالک کے لیے وضع کردہ رہنما اصولوں (acquis communataire) کے مختلف اجزا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یعنی ان اقدار، اصولوں اور حقوق کا جن کی قبولیت یورپی یونین (ای یو) کی رُکنیت کے حصول کی خواہاں ریاست کے لیے ایک پیشگی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ یورپی یونین کی قانونی شقیں، یورپی عدالتِ انصاف (ECJ) کے فیصلے اور یورپی عدالت برائے انسانی حقوق (ECHR) کے ضوابط بھی ان رہنما اصولوں میں شامل ہیں۔ بشمول ان آئینی روایات کے جو رُکن ریاستوں میں پروان چڑھتی رہی ہیں۔ یہاں صرف آخری جزو کو اس دلیل کے ساتھ زیرِغور لایا گیا ہے کہ ریاست اور مذہب کے باہمی تعلق کے حوالے سے تشکیل کردہ یورپی نمونہ [یورپی یونین] کی رکن ریاستوں کی آئینی روایات کا عکاس نظر آتا ہے۔ اس امر کو مضمون کے آخر میں زیرِ بحث لایا گیا ہے کہ آیا ''رکن ممالک کے اتحاد و اشتراک کے رہنما اصول'' ان مطالبات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو یورپی یونین میں تیزی سے پروان چڑھتے ہوئے مذہبی تنوع کی صورت میں منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔

تعارف

اس مضمون کا مقصد درج ذیل سوالوں کا جواب دینا ہے:

۱۔ جب ایک مرتبہ کسی ریاست کی جانب سے یورپی یونین کی رکنیت کے لیے دی جانے والی درخواست کو زیرِ غور لانے کی منظوری دے دی جاتی ہے اور اس حوالے سے گفت وشنید کا آغاز ہو جاتا ہے تو درخواست دینے والی ریاست مذہب اور مذہبی طبقات کے حوالے سے کس طرح کی توقعات رکھ سکتی ہے؟

۲۔ یورپی یونین کس طرح کے مطالبات پیش کر سکتی ہے اور کس طرح کی قانونی تبدیلیوں کا تقاضا کیا جا سکتا ہے؟

ان سوالات کا جامع جواب تو ممکن نہیں ہے کیونکہ ہر ریاست کا اپنا قانونی نظام ہوتا ہے اور یورپی یونین کی طرف سے بعض مخصوص نوعیت کے مطالبات کے پس پردہ اس نظام کی اپنی خصوصیات کا محرّک کارفرما ہوتی ہیں۔ تاہم ان کا ایک جزوی جواب دیا جا سکتا جس کا تعین ان عوامل سے ہوگا جن کا دارومدار یورپی یونین کی عائد کردہ شرائط پر ہوتا ہے اور یوں ان کی تکمیل یورپی یونین میں شامل ہونے کی خواہاں ریاست کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

ان حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی یورپی یونین اور اس کی رکن ریاستوں کے درمیان مخصوص نوعیت کے تعلقات کے تقاضوں کے پیشِ نظر متذکرہ سوالات کے جواب کا حصول اتنا آسان نظر نہیں آتا۔ ریاستوں کی طرف سے عام طور پر بین الاقوامی تنظیموں کو جو اختیارات سونپے جاتے ہیں، یورپی یونین کے پاس اس سے بہت زیادہ اختیارات ہوتے ہیں۔ یورپی یونین کی رکن ریاستیں بعض حوالوں سے کسی حد تک اپنی خودمختاری سے بھی دستبردار ہو چکی ہیں۔ کچھ شعبوں میں جو اختیارات کبھی ریاستی خودمختاری کے ضمن میں آتے تھے وہ اب یا تو یورپی یونین کو تفویض کیے جا چکے ہیں یا پھر رُکن ریاستوں اور یورپی یونین کے مشترکہ اختیارات بن چکے ہیں۔ دوسرے شعبوں میں ریاستی اختیارات اپنی جگہ

پر ابھی تک مستحکم ہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ ایک ایسی مکمل (بعض کے خیال میں پُر تکلف یا نمائشی) تعمیر نو کی صورت میں سامنے آیا ہے جس میں یورپی یونین کا قانون اور رکن ریاستوں کا قانون مدغم ہونے کے ساتھ ہی باہمی اثرات کے حامل ربط کا پابند ہو چکا ہے۔ چنانچہ ''یورپی یونین کے قانونی نظام'' کے مکمل مفہوم کا تعین آسان نہیں رہا۔

ایک اور عنصر کو مدّنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ رکن ریاستوں نے کافی حد تک یورپی یونین پر سیاسی گرفت کو برقرار رکھا ہوا ہے اور اس کی وساطت سے وہ اکثر اوقات یورپی یونین کے فیصلوں کو ایسا رُخ دینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جو زیرِ غور مسئلے پر ان کے اپنے نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتا ہے۔ یورپی یونین کے بعض فیصلوں کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہوگا کہ رکن ریاستوں کی مروجہ قانونی اور سیاسی روایات کو بھی مدّنظر رکھا جائے (اس ضمن میں یورپ کے آئین کی تمہید کے طور پر یورپ کے عیسائی ورثے کا حوالہ دیے جانے سے متعلق بحث ایک اچھی مثال کے طور پر سامنے آتی ہے)۔ چنانچہ رکنیت کی درخواست دینے والی ریاست کو پہلے سے شامل ریاستوں کے قانون کو بھی مدّنظر رکھنا چاہیے کیونکہ یہ یورپی یونین کے لیے درخواستوں پر بالواسطہ طور پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اس مضمون یا مقالے کا پہلا حصہ مذہب کے معاملے میں ''رکن ممالک کے لیے وضع کردہ رہنما اصولوں'' یا "acquis communautaire" کے مفہوم کی وضاحت کے لیے وقف کیا گیا ہے اس طرح سے یورپی یونین کے قانون کے متعلقہ مآخذ کی دریافت کی جائے گی۔ ا دوسرے اور نسبتاً چھوٹے حصے میں ان بالواسطہ اثرات کا حوالہ دیا جائے گا جو کہ رکن ریاستوں کی قانونی روایات یورپی یونین پر مرتب کر سکتی ہیں۔ اس تجزیے کے نتائج کا خلاصہ حتمی نکات میں پیش کیا جائے گا۔

رُکن ممالک کے لیے وضع کردہ رہنما قوانین

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو ریاستیں یورپی یونین میں شامل ہو جاتی ہیں انہیں ''رہنما قوانین'' اپنانے، نافذ کرنے اور ان پر عمل درآمد کروانے کا کہا جاتا ہے، یعنی یورپی یونین کے وضع کردہ قوانین کا